© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ہمارا دستوری مستقبل کیا ہے؟ کیسی سیاسی تقدیر ہمارے پلّے پڑنے والی ہے؟ ہم کیا ہیں، ہمیں کیا ہونا چاہیے؟ ہم کدھر سے آئے ہیں، ہمیں کدھر جانا ہے؟ ہماری منزل کہاں ہے اور ہمارا راستہ کدھر سے جاتا ہے؟

دنیا کے نقشے پر کسی ریاست کے ابھرنے سے پہلے اور کسی نئی ہیئتِ اجتماعی کے ظہور سے قبل اس سوال کا جواب وہ عوامل طے کر چکتے ہیں جو ایک مملکت اور ایک معاشرے کو تشکیل دیتے ہیں۔ کچھ خیالات ہوتے ہیں جو دوسرے خیالات کو شکست دے کر آگے آ چکتے ہیں۔ کوئی نظریہ ہوتا ہے جو دوسرے نظریات کو توڑتا پھوڑتا، ان کے سازگار جوہر کو اپنے اندر جذب کرتا اور ان کے ناسازگار عناصر کو پاؤں میں روندتا واقعات و حوادث کی زمام ہاتھ میں لے چکتا ہے۔ ایک اجتماعی ذہن ہوتا ہے جو تبھی تاریخ کے گوناگوں مراحل کی بھٹیوں میں ڈھلتا ڈھلاتا اور تحریکیت کے کسی خاص طرح کے سانچوں میں کوئی متعین شکل اختیار کرتا فرد فرد پر اپنا پرتو ڈال چکتا ہے۔ ایک نصب العین بے شمار اجتماعی تقاضوں اور ضرورتوں، فلاح و بہبود کے تصورات، معاشرے کے بے شمار تفصیلی مقاصد کو اپنے اندر سمیٹتا نگاہوں کو اپنے اوپر مرتکز کر چکتا ہے۔ ایک خاص اخلاقی تصور مؤثر قدروں اور روایات کے سرچشموں سے سیراب ہو ہو کر پروان چڑھ چکتا ہے۔ ایک ذوقِ جمالیات معتقدات فطری ماحول اور تاریخی ارتقاء کے ملے جلے اثرات سے اپنے معیارات طے کر چکتا ہے۔ اس سارے سرمایۂ تعمیر کو ساتھ لے کر جب کوئی کاروانِ حیات آزادی و استقلال کے مرحلے میں داخل ہوتا ہے تو کسی تامل و توقف کے بغیر تعمیرِ نو شروع ہو جاتی ہے۔ نقشۂ تعمیر موجود ہوتا ہے، مسالہ تیار رہتا ہے، انجینئر اور معمار پوری صلاحیتوں کے ساتھ آگے آ جاتے ہیں اور معاشرہ کے تمام افراد مزدور بن کر اپنا تعاون پیش کر دیتے ہیں۔

لیکن تاریخ انسانی میں ایک ایسی انوکھی ریاست اور ایک ایسے نرالے معاشرے کی واحد مثال پیش کرنے کا شرف پاکستان کو حاصل ہوا ہے جس کے ساڑھے سات برس کوئی تعمیری قدم اٹھائے بغیر گذر گئے۔ بلکہ اتنی لمبی مدت جس میں تاریخ دوسری سرزمینوں میں نہ جانے کتنی پلٹیاں کھا چکی ہے اور دوسرے معاشروں میں حدوث و تغیر نے کیا کیا گل کھلا دئے ہیں۔ یہاں ابھی تک یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ایسی ایسی زبانوں سے بولتا ہوا ملے گا کہ آپ حیرت میں ڈوبے رہ جائیں گے۔ ہاں! اجتماعی ذہن اسی طرح ہر ہر زبان سے بولا کرتا ہے۔

درحقیقت ہمارے لٹریچر پر قرآن اور حدیث اپنا سایہ پھیلائے ہوئے ہیں۔ یہ ہماری لٹریری سرگرمیوں کا منبع ہیں۔ قرآن جس کے ایک ایک لفظ کے من جانب اللہ اور برحق اور نور و ہدایت ہونے پر ہمارا ایمان ہے، قرآن جسے ہمارے حافظے سینے میں جذب کرتے ہیں، قرآن جسے خواندہ اور ان پڑھ سارے ہی طبقے پڑھتے ہیں، قرآن جسے نمازوں میں دوہرایا جاتا رہتا ہے، قرآن جس پر درس ہوتے ہیں، قرآن جس سے ہماری مجالس کی کارروائیوں کا افتتاح ہوتا ہے، قرآن جس کے مقابلے پر آج تک کوئی دوسری کتاب ہمارے ہاں شائع نہیں ہوتی، وہ قرآن جو ہمارے عالم افکار پر آفتاب بن کے چمکتا ہے۔ اور حدیث جسے ہم قرآن کی مستند شرح مانتے ہیں، حدیث جس میں رسولِ خدا کی نمونہ کی زندگی کا ریکارڈ ہے، حدیث جس کے ریکارڈ کرنے، جس کے نتھارنے، جس کو بعد کی نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے انتہا درجہ کی محنتیں اور دماغ سوزیاں کی گئی ہیں، حدیث جو ہمارے دینی نصاب کا اہم جزو ہے، حدیث جس سے قانونِ شرعی کی مستند تفاصیل ملتی ہیں، حدیث جس سے روزمرہ زندگی میں رہنمائی لی جاتی ہے۔ وہ حدیث جو ہمارے علمی و ادبی چمن زاروں پر ہمیشہ ابرِ بہار بن کے برسی ہے۔ قرآن و حدیث وہ فکری طاقت ہیں جس نے ہمارے سوا ہزار سالہ لٹریچر کو مستقل اسلامی مزاج دیا ہے۔

اجتماعی ذہن کی یہ کارفرما طاقت جس کا آئینہ دار ہمارا وسیع لٹریچر ہے کس طرح اتنا بے وزن قرار دیا جا سکتا ہے کہ ایک قوم کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ اس کے علی الرغم کسی دوسری شکل میں کر دیا جائے۔ نہ اس لٹریچر کو کتب خانہ بغداد کی طرح آگ کے شعلوں اور دجلہ کی لہروں کے حوالے کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی چھومنتر سے اس کے مزاج کو بدلا جا سکتا ہے، اور نہ اسے نظر انداز کر کے ایک انچ بھی آگے بڑھنا ممکن ہے۔

اجتماعی ذہن اگر شعور و فکر کا مظہر ہوتا ہے تو اسی کے ساتھ ایک دوسری چیز اجتماعی ضمیر پائی جاتی ہے جو وجدانی رجحانات کی ترجمانی کرتی ہے۔ جس قوم کا اجتماعی ضمیر مر جاتا ہے اس کے ساتھ جو کچھ بھی آپ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں اور جدھر بھی اسے لے جانا چاہیں لے جا سکتے ہیں۔ وہ نت نئے سانچوں میں پڑ کر اپنی شکل بدل سکتی ہے اور نت نئی سمت کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوموں کی دستوری ہیئت کے بنانے میں بڑا حصہ ان کے اساسی معتقدات کا ہوتا ہے۔ خدا اور کائنات اور انسان اور زندگی کی حقیقت کے بارے میں جو تصورات راسخ ہو کر عقیدے بن جاتے ہیں۔ اجتماعی زندگی ان سے بے نیاز ہو کر کوئی شکل اختیار نہیں کر سکتی۔ ہر قوم کا ایک نہ ایک فلسفہ ہوتا ہے جو معاشرے میں رچ بس جاتا ہے۔ فلسفے اور نظریے اور عقیدے کے بغیر کبھی کوئی اجتماعی ہیئت موجود نہیں پائی گئی۔ اب کیا دنیا کی ہم ہی وہ انوکھی قوم ہیں جس کے فکر و عمل کی کھیتی میں ایمان و اعتقاد کا سرے سے کوئی تخم تھا ہی نہیں، اور اگر کبھی تھا بھی تو وہ گل سڑ چکا ہے اور اب کوئی چیز ایسی باقی نہیں جو اندر سے زور کر کے فطری طور پر اپنی کونپلیں نکالے۔ بس جو کچھ چاہو باہر سے لا کر گاڑ دو۔ ہمارے پاس کوئی تصورِ حقیقت نہیں ہے، ہم کوئی خیالات نہیں رکھتے، کسی طرح کی متاعِ افکار ہمارے پاس نہیں ہے، کسی نوعیت کے ملی شعور سے ہم بہرہ اندوز نہیں ہیں، ہمارا کوئی زاویۂ نگاہ نہیں، کوئی طرزِ فکر نہیں۔ ہم یونہی جڑوں کے بغیر پیدا ہو گئے تنے کے بغیر بڑھتے چلے گئے، رگوں میں غذا جذب کیے بغیر ہم برگ و بار لاتے رہے۔ اعتقاد اور فکر کے بغیر لکڑی اور پتھر اور گدھے اور خچر کا تصور تو کیا جا سکتا ہے، آدمی اور آدمی کے کسی معاشرے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ہم نہ صرف حقیقت کا ایک خاص امتیازی اعتقاد رکھتے ہیں بلکہ اسی اعتقاد نے ہمیں ایک نئی ملت کی حیثیت سے تشکیل دی ہے، ہمیں پروان چڑھایا ہے اور ہمیں اتنی صدیوں تک اپنے مستقل وجود کے ساتھ زندہ رکھا ہے ـــ اور سخت ناسازگار حالات میں زندہ رکھا ہے۔ اس اعتقاد سے ہمارا نقطۂ نظر اور ہمارا طرزِ فکر بنتا ہے، اس سے افکار کا ایک مستقل سرچشمہ ہمارے اندر پھوٹ کے بہہ رہا ہے۔ اس سے ہمارے مخصوص خیالات کی کلیاں نکل نکل کر کھلتی ہیں۔ یہ ہماری زندگی کا وہ اُمّ بیج ہے جس سے امنگیں اور آرزوئیں اور ارادے اور عملی منصوبے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اعتقاد مضبوط رہے تو ہم مضبوط رہتے ہیں۔ یہ کمزور پڑ جائے تو ہم بھی کمزور پڑ جاتے ہیں۔ یہ دب جائے تو ہم بھی دب جاتے ہیں، یہ ٹھنڈا ہونے لگے تو ہم بھی ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ یہ مرجھا جائے تو ہم بھی مرجھا جاتے ہیں۔ یہ نئی کروٹ لے تو ہم بھی نئی کروٹ لینے لگتے ہیں، اور خدانخواستہ یہ اگر مر جائے تو ہم بھی موت کا شکار ہو جائیں گے۔ یہی ہمارا مرکزی شرارِ حیات (SPARK OF LIFE) ہے۔

ہمارا اساسی اعتقاد زندگی کے متعلق یہ ہے کہ یہ کائنات ایک قوتِ برتر کی پیدا کردہ اور اسی کی منظم اور آئینی سلطنت ہے اس سلطنت میں تمام موجودات کی طرح ہمارے لیے اگر کوئی جگہ ہے تو اس قوتِ برتر کی بندگی و اطاعت کی جگہ ہے۔ ہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خود وہ قوتِ برتر نہیں ہیں جو اس نگری کا راج چلا رہی ہے۔ نہ ہم اس کے شریکِ کار اور حصہ دار ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنے لئے ایک ہی مقام نظر آتا ہے جو اس کی رعیت بن کر رہنے کا مقام ہے۔ ہمارا اساسی اعتقاد جہاں وہ ہے، وہاں یہ بھی ہے کہ وہ قوتِ برتر ہمارے بھلے برے سے بے تعلق اور بے توجہ نہیں ہے بلکہ اس نے زندگی بسر کرنے کے لیے آقا اور بادشاہ اور مالک الملک (SOVERIGN) ہونے کی حیثیت سے ہمیں ایک ضابطہ، ایک ہدایت نامہ اور کام کرنے کا ایک نقشہ دیا ہے۔ اس ضابطے اور ہدایت نامے اور نقشے پر کام کرنے کے لیے اس نے عملی نمونہ پیش کر دینے کے لیے ہمارے اندر سے بہترین انسان کھڑے کیے ہیں۔ پھر ہمارا اساسی اعتقاد یہ ہے کہ اس قوتِ برتر جسے ہم اللہ اور خدا کہتے ہیں — کی دی ہوئی ہدایت اور اس کے مامور انبیاء کے عملی نمونے سے ہٹ کر زندگی کو جو بھی شکل دی جائے وہ ہمارے فطری موقف سے متصادم، امرِ حق کے بالکل خلاف اور نتائج و اثرات کے لحاظ سے مہلک ہے۔ پھر ہمارا اساسی اعتقاد یہ ہے کہ حق اور باطل، خیر اور شر، صلاح اور فساد، نیکی اور بدی کی تقسیم جس طرح اللہ تعالیٰ اور انبیاء نے کر دی ہے اس کے خلاف کوئی اور تقسیم قابلِ قبول نہیں ہے۔ پھر ہمارا اساسی اعتقاد یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کی سرگرمیوں میں غیر مسئول اور غیر جوابدہ نہیں ہیں بلکہ ہمیں اپنے کارنامۂ زندگی کا پورا پورا حساب پائی پائی کر کے اسی آقا اور مالک الملک کے سامنے پیش کرنا ہے کہ کہاں تک ہم وفادار رعیت بن کر رہے اور کہاں تک ہم نے انحراف اور بغاوت کا راستہ اختیار کیا اور پھر وفاداری پر امن و مسرت کی دوامی زندگی کی جزا اور بغاوت پر دکھ اور عذاب کی دوامی زندگی کی سزا ملنے والی ہے۔

یہ ہے اساسی اعتقاد کا وہ بیج جس سے ہمارے سارے عقیدے، نظریے، افکار، خیالات اور تصورات رونما ہوتے ہیں اور جو ہمارے زندگی کے ہر شعبے کے لیے ہماری ضرورت کے اصول مہیا کرتا ہے۔ اس اعتقاد سے ہوتے ہوئے ہم کوئی ایسا ریاستی ڈھانچہ نہیں سوچ سکتے جو خدا کی حاکمیت کے تصور کو بالائے طاق رکھ کر تجویز کیا جائے، ہم کوئی ایسا دستور نہیں بنا سکتے جس میں ہم اپنے آپ کو اسی بندگی کی پوزیشن پر نہ رکھیں جو کچھ کہ خدا کی اس سلطنت میں از روئے واقعہ اور از روئے فطرت ہے۔ ہم کوئی ایسا سرچشمۂ قانون اور کوئی ایسے قانونی اصولیات کہیں سے لے کر اپنا نہیں سکتے جو کتاب و سنت کے مصدر و ماخذ سے ٹکراتے ہوں۔ ہمارے سیاسی رجحانات کا کوئی بہاؤ اس اعتقاد سے آزاد ہو کر واقع نہیں ہو سکتا۔

اس اعتقاد کے اثر سے آزاد ہو کر ہماری سیاسی تعمیر اور ہمارے دستوری مستقبل کی تشکیل دو ہی صورتوں میں قابلِ تصور ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک یہ کہ یہ اعتقاد سرے سے نہ کوئی تقاضا رکھتا ہو، نہ ہمارے اندر سے کوئی تحریک کرے۔ نہ ہمارے سوچنے کے انداز پر اپنا پرتو ڈالے۔ یقین جانیئے کہ دنیا کا کوئی کمزور ترین اعتقاد ایسا غیر موثر اور غیر فعال اور غیر محرک نہیں ہو سکتا، کجا کہ معاملہ ایسے اعتقاد کا ہو جس نے بار بار تاریخِ انسانیت میں عظیم درجے کی ملتیں برپا کی ہوں، جس نے تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ موڑ دیا ہو، جس نے تمدن و تہذیب کے نئے نئے طوفان کھڑے کر دیئے ہوں اور جس نے نظام ہائے باطل کی جمی ہوئی تونّوں کو اکھیڑ اکھیڑ پھینکا ہو۔ یہ وہ اعتقاد ہے جو ایک طرف دماغوں کو فتح کر لینے والا عقلی استدلال رکھتا ہے اور دوسری طرف دلوں میں بڑے بڑے معرکوں کے لیے تیار کر دینے والے جذبات کو ابھار دیتا ہے۔ یہ حد درجہ کی عقلی قوت سے بھی مالا مال ہے اور حد درجہ کا جذباتی زور بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایسے عقیدے زمانے کی ہزاروں گردشوں سے گزر کر بھی بے جان اور بے قوت اور بے اثر نہیں ہو سکتے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم پیچھے سے اس اعتقاد کو اپنے اندر سے کھرچ کر آئے ہوتے، اور یہ نہیں تو کم سے کم اب سات ساڑھے سات سال کے دورِ آزادی میں اس فیصلے پر پہنچ جاتے کہ اس اعتقاد کو ساتھ لے کر ہم زندگی کا ایک قدم بھی آگے نہیں اٹھائیں گے۔ یہ کام اگر ہو سکنے والا تھا تو اسے اب تک ہو جانا چاہیے تھا۔ اس اعتقاد کو ہمیں پھانسی پر لٹکا کر اور اس کی لاش فرسودگی کی قبر میں دفن کر کے، اوپر سے فاتحہ، قل اور چالیسویں کی ساری رسوم پوری کرنے کے بعد صاف صاف اعلان کر دینا چاہیے تھا کہ اب ہم مسلمان نہیں رہے ہیں ہم نے صدیوں پرانے اسلام سے فارغ خطی حاصل کر کے نئی راہوں پر چل نکلنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

لیکن یہ کام نہیں ہو سکا۔ جابر سے جابر بادشاہتوں کو اس میں ناکامی ہو چکی ہے۔ گونا گوں ذہنی، مذہبی، کلامی اخلاقی اور فرقہ وارانہ فتنوں سے یہ بازی سر نہ ہوئی۔ چنگیز و ہلاکو کی تلواریں اس کھیل کو جیت نہ سکیں۔ مغربی امپیریلزم کے لاؤ لشکر اس لڑائی میں فتح نہ پا سکے۔ خود برعظیم ہند میں کانگریس کی متحدہ قومیت اور سیکولر ڈیماکریسی کی طوفانی دعوت ہمارے اعتقاد کے قلعے کو سر نہ کر سکی۔ کسی سر سید اور نیاز فتح پوری اور کسی غلام احمد اور کسی پرویز کی مساعی اس معاملے میں برگ و بار نہ لا سکیں۔ تو لوگو! اب اور کس شبھ گھڑی کا اور کس پہلوان کا اور کس نئے ہتھیار کا انتظار کر رہے ہو کہ چار [illegible] جھینے کے بعد اس اعتقاد کے مطالبوں اور تقاضوں سے جان چھڑائی جا سکتی ہے۔

اگر مسلمان ایک زندہ قوم ہیں تو ان کا اعتقاد ایک اٹل قوت ہے۔ اس اٹل قوت کو غیر موجود فرض کر کے کوئی دستوری ہیئت اور کوئی سیاسی تقدیر تجویز یا اختیار نہیں کی جا سکتی۔ تاریخ جو قدم بھی اٹھائے گی اس اعتقاد کی رضامندی سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اٹھا سکے گی، یہ اعتقاد اگر اس کا ساتھ نہیں دے گا تو تاریخ کی ندی کا ایک ایک قطرہ منجمد ہو کر اپنی جگہ پر تھم جائے گا اور کسی دوسری طاقت کی مجال نہیں کہ وہ اس کے بہاؤ کو جاری کر سکے۔ چنانچہ آج سات برس سے یہ بہاؤ اسی لیے رکا ہوا ہے۔ جب اس اعتقاد کی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے، از سر نو حرکت شروع ہو جاتی ہے اور جب یہ اہمیت نظر انداز کی جاتی ہو تو پھر ڈیڈ لاک پیدا ہو جاتا ہے۔

قوموں اور معاشروں کے مستقبل کو بنانے والا ایک بڑا زوردار عامل ان کی اپنی تاریخ ہوتی ہے۔ کسی کا مستقبل ہوا میں کھڑا نہیں ہو جاتا بلکہ ہمیشہ ماضی کی مضبوط زمین پر کھڑا ہوتا ہے۔ واقعات کا تسلسل ہوتا ہے جو پیچھے سے جس نہج پر چلا آ رہا ہوتا ہے اسی کے مطابق آگے کچھ نتائج نکلتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہوتا کہ انسانی زندگی میں یکایک کوئی ایسا نقشہ ابھر آئے جس کے پیچھے واقعاتی تسلسل سرے سے موجود نہ ہو، ایک دستور ایسا اس کے ذہن سے آ نکلے جیسے پچھلی ساری تاریخ سے کوئی رابطہ نہ ہو۔ ایک سیاسی ہیئت ایسی نمودار ہو جائے جس کا ماضی سے کوئی جوڑ نہ ہو۔ معاشرہ ایسے نظریے اور نصب العین کو لے کے اٹھ کھڑا ہو جسے پچھلی تاریخ نے کبھی اپنی گود میں لے کر پالا نہ ہو۔

پھر کیا ہماری کوئی تاریخ نہیں ؟ کیا ہم یکایک ابھی ابھی منصۂ شہود پر ابھرے ہیں جنہیں ورثے میں کوئی تاریخ نہیں ملی، بلکہ جو کچھ بھی بنانا ہے وہ اب بنانا ہے ؟ کیا ہمارا کوئی ماضی نہیں جسے ہم اپنے مستقبل کی بنیاد بنائیں ؟ کیا ہمارے پاس ملی تجربات کا کوئی خزانہ نہیں کہ جس کی روشنی میں ہم تعمیرِ نو کا نقشہ بنائیں ؟ کیا ہمارا سرمایۂ دوش کچھ نہیں کہ جس کے بل پر اپنے فردا کا آغاز کریں ؟

اگر ہماری کوئی تاریخ ہے ——— اور یقیناً ڈیڑھ ہزار سال کی عظیم تاریخ ہے ——— تو کیا کوئی ترکیب ایسی ہے کہ ہم اس کے نقوش کو وقت کے اوراق پر سے دھو ڈالیں ؟ ہم اس کے نشانات کو اجتماعی حافظے سے الگ کر سکیں ؟ ہم ماضی اور مستقبل کا رشتہ کاٹ ڈالیں، ہم دوش اور فردا کے جوڑ کو کھول دیں ؟ ہم اپنے آنے والے کل کا پیوند اپنے گذرے ہوئے کل اور آج سے جدا کر سکیں ——— یہ قطعی طور پر ناممکن ہے ؟

ہماری تاریخ ایک ہمزاد کی طرح ہمارے ساتھ ہے، ہماری تاریخ ہمارے فکر و شعور، ہمارے جذبات و احساسات اور ہمارے خلق و کردار پر اپنی چھاپ ڈالے ہوئے ہے، ہماری تاریخ ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہماری تاریخ ہمارے سینے میں گھر کئے ہوئے ہے، ہماری تاریخ ہمارے دماغوں کی تہوں میں اتری ہوئی ہے، یہ تاریخ ہماری اجتماعی زندگی کا گوشت پوست بن چکی ہے۔ ہم اپنے اس خزانۂ بیش بہا کو جب سے پیدا ہوئے ہیں کندھوں پر لادے چلے آرہے ہیں۔ اس سرمایۂ حیات کو ہم سینوں سے لگائے ہوئے جادۂ حیات پر گامزن ہیں۔ یہ ہماری فکروں میں کروٹیں لیتی ہے، یہ ہمارے جذبوں میں متحرک ہے، یہ ہماری تقریروں میں بولتی ہے، یہ ہماری تحریروں میں ظہور کرتی ہے۔ یہ ہمارے شعروں میں مسکراتی اور آنسو بہاتی ہے، یہ ہماری کہانیوں میں اپنی رام کہانی کہتی ہے، یہ ہمارے نغموں میں اپنے راگ الاپتی ہے۔ یہ ہمارے ارادوں کی امڈتی ہوئی بوجھل گھٹاؤں میں بجلی بن کے کوندتی ہے اور یہ ہماری تحریکوں کے سیلِ تند و تیز میں لہریں بن بن کے آگے بڑھتی ہے۔

پھر یہ شرمناک تاریخ ہوتی تو یقیناً اس قابل تھی کہ اسے دریا برد کر دیا جائے۔ یہ اگر قدر و قیمت سے خالی ہوتی تو اسی سلوک کی مستحق ہوتی کہ نہایت بے رحمانہ اپریشن سے اس کی جڑوں کو ہم اپنے اجتماعی ذہن سے کھرچ کر الگ کر دیتے لیکن یہ ایک ایسی قوم کی جدوجہدِ حیات کی داستان ہے جس نے انسانیت کو ایک پاکیزہ فکر، ایک ہمہ گیر نظریۂ حق، ایک نظامِ صالح، ایک اجتماعی اخلاق اور ایک روشن تہذیب دی ہے، جس نے علم و فن کو اپنی خدمات سے چار چاند لگا دئے ہیں، جس نے انسان کو اس کے پورے حقوق دلوائے ہیں، جس نے ترقی کے وہ دروازے کھولے ہیں جن پر قفل پر قفل لگے ہوئے تھے۔ اور ہاں یہ اس عظمت مآب قوم کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی کہانی ہے جس نے ظلم و جبر کی بے شمار گھاٹیاں طے کیں مگر اپنی متاعِ فکر کا کوئی حصہ راستے میں ضائع نہیں ہونے دیا، جس نے بے بسی اور غلامی، معاشی خستہ حالی اور معاشرتی فساد، ہجرتوں اور جلاوطنیوں کے رنگا رنگ صبر آزما دور دیکھے مگر سنگین سے سنگین حالات اسے اپنی حقیقت سے غافل نہ کر سکے۔ اور ہاں یہ اس لامثال قوم کے تبسموں اور آنسوؤں کی سرگذشت ہے جس نے انقلابات کی بے شمار گردشوں سے گذرنے کے بعد نہ اپنے مرکزِ اعتقاد کو چھوڑا، نہ اپنے نصب العین سے نگاہ ہٹنے دی۔ ایک زندہ قوم کی ایسی زندہ تاریخ کو دریا برد نہیں کیا جا سکتا۔

اس تاریخ کے حوادث کی تمام کڑیوں کو اوپر سے نیچے تک ہمارا جو مستقل شعور و احساس جوڑ کر ایک کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم مسلم ہیں۔ یہ شعور و احساس اگر نابود ہو سکتا تو اس تاریخ کا ربط ختم ہو جاتا، اس کے واقعات کا شیرازہ کھل جاتا اور ورق ورق الگ الگ بکھر گیا ہوتا، اس کا تسلسل ختم ہو جاتا اور کل اور آج کو جوڑنے والی کوئی طاقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باقی نہ رہتی۔ پھر یہ شعور و احساس ایسا گہرا ہے اور موثر ہے کہ نظام کے انتہائی فاسد ہو جانے پر اور ماحول کے حد سے زیادہ بگڑ جانے پر اور معاشرے کی فضا کے شدید طور سے مکدر ہو جانے پر بھی ہمیشہ زندہ رہا ہے، یہ اُس حالت میں بھی زندہ رہا ہے جب کہ ناسازگار ماحول نے افراد کی عملی زندگیوں کو بالکل چوپٹ کر ڈالا ہے، بلکہ حد یہ کہ آج ہمارے بعض بگڑے ہوئے افراد جو اسلام کے راستے میں روڑا بنے پڑے ہیں، وہ اپنی ساری حرکات کے بعد بھی یہ جرأت نہیں کر سکتے کہ مسلم ہونے کا انکار کر کے اور اسلام سے صاف علیحدگی اختیار کر کے سامنے آئیں۔ ہماری پوری تاریخ میں ایسا نہیں ہوا۔ پھر یہ شعور و احساس محض زندہ ہی نہیں رہا بلکہ یہ نظام اور ماحول اور معاشرے کے بگاڑ کے خلاف ہمیشہ ٹکر لیتا رہا ہے۔ اس نے بار بار جد و جہد کے لیے ذہین اور شریف اور بہادر لوگوں کو ہمارے اندر سے اٹھا کھڑا کیا ہے۔ اس نے مسلمانوں کو کسی غیر اسلامی اصول اور ہیئت کے زیر سایہ چین سے نہیں بیٹھنے دیا اور کسی غیر اسلامی نظریے سے مصالحت نہیں کرنے دی۔ اس نے اضداد میں سمجھوتہ نہیں ہونے دیا۔ اس نے ہمارے اندر کے اونچے لوگوں سے قابلِ یادگار قربانیاں دلوائی ہیں اور یہ قربانیاں بعد کی نسلوں کے لیے راستہ دکھانے والی مشعلوں کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ ہمارا یہ شعور و احساس جو ہماری تاریخ میں وہاں سے یہاں تک چھایا ہوا ہے، پچھلی ساری قربانیوں کی طاقت اپنے اندر سمیٹ کر آج ہمارے اجتماعی ذہن میں موجزن ہے۔ یہ تاریخ جو صرف منفعلانہ تاریخ نہیں بلکہ ہماری جد و جہد کی تاریخ ہے، جو ٹھنڈے اور جامد مزاج کی نہیں بلکہ گرم اور متحرک مزاج کی مظہر ہے، وہ ناسازگار حالات سے دب جانے والے ارادوں کی نہیں، بلکہ مخالف قوتوں سے ٹکرا جانے والے عزائم کی آئینہ دار ہے۔ کیا یہ ایسی غیر موثر چیز ہو سکتی ہے کہ یہ اپنے جوہرِ زندہ کے مزاج سے برعکس قسم کے کسی دستور اور کسی سیاسی ہیئت کو اپنے سائے میں پنپنے دے؟ کیا یہ تاریخ جس کے سارے کے سارے ابواب احیائے اسلام کی تحریکوں کی روداد سے بھرے ہیں، آج ان سارے ابواب پر خطِ نسخ کھینچنے والا کوئی سیاسی نظریہ و نظام اختیار کیا جا سکتا ہے؟ دستور وہی چلے گا، نظام وہی جم سکے گا جو اس تاریخ میں کارفرما رہنے والے ہمارے ملی شعور و احساس سے مطابقت رکھتا ہو۔ ورنہ گول خانے میں چوکھونٹی چیز کو فٹ کرنے کی کوشش، قوم کو کبھی چین سے نہ بیٹھنے دے گی۔

ایک ملت یا معاشرے کے خارجی واقعات و حالات ہی کا نام تاریخ نہیں ہوتا بلکہ تاریخ بنانے والی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بڑی طاقت خود خیالات کی طاقت ہوتی ہے۔ ملت کا اجتماعی ذہن جہاں حالات و واقعات سے متاثر ہوتا ہے وہاں خیالات کی طاقت کے ذریعے خود ان کو متاثر بھی کرتا ہے۔ سیاسی، معاشی اور معاشرتی حوادث اور اجتماعی ذہن کے فکر و خیال کی لہریں آپس میں جو عمل و ردِ عمل جاری رکھتی ہیں۔ ان کے مشترک عمل سے تاریخ تشکیل پذیر ہوتی ہے تاریخ اجتماعی ذہن کے زیر اثر بنتی ہے اور اجتماعی ذہن تاریخ کے زیر اثر ارتقا کرتا ہے۔ پس کسی ملت اور معاشرے کا اجتماعی ذہن خود ایک ایسی طاقت ہے جو اس کے مستقبل کو بنانے والے عوامل میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اجتماعی ذہن کا سمندر ہوتا ہے جو اپنے اندر سے خیالات کی رویں اور لہریں اٹھاتا ہے، حوادث اپنے پتھر اس کے اندر پھینکتے ہیں تو بھنور بنتے ہیں اور ان کے گرد لہروں کے دائرے بن بن کر پھیلتے جاتے ہیں، انقلاب کے جھکڑ چلتے ہیں تو وہ پانی کو اپنی سمت پر دھکیلتے ہوئے جنبشیں پیدا کرتے ہیں، پھر دوسرے سرچشموں سے بہہ کر آنے والے افکار و خیالات کے ندی نالے اس میں آکر گرتے ہیں تو دُور تک ان کے ریلے اپنا اثر ڈالتے جاتے ہیں۔ اجتماعی ذہن کا سمندر ان مختلف حرکت زا طاقتوں کے ذریعے ہر آن بلویا جاتا رہتا ہے اور ہر آن وہ اپنی سطح کو بحال اور اپنی اندرونی لہروں اور رووں کو غالب رکھنے میں زور کرتا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے ہمارا اجتماعی ذہن ایک ایسا سمندر ثابت ہوا ہے جس کی داخلی رویں اور لہریں بیرونی تحریکوں پر ہمیشہ چھائی رہی ہیں۔ مثلاً روم و ایران کی تہذیبی برتری نے ہمارے اوپر اثر ڈالنا چاہا لیکن ایک پیش نہ گئی۔ پھر یونان کا فلسفہ آگے بڑھا لیکن بہت جلد اس کا زور ٹوٹ گیا۔ پھر عجمی تصوف نے حملہ کیا لیکن ہمارے اجتماعی ذہن نے اس کے مقابلے میں بھی اپنی امتیازی ساخت کو بحال کر لیا۔ ہندو کلچر نے اس حصار کو توڑنے کی کوشش کی، لیکن فصیل میں چند دراڑیں ڈالنے سے زیادہ کچھ نہ کیا جا سکا۔ آخر میں جدید مغربی مادہ پرستانہ فکر و تمدن نے ایک بے پناہ یورش ہمارے اوپر کی ہے لیکن ہر ہر مورچے میں فاتحانہ اور غالبانہ طاقت کے ساتھ زور آزمائی کرنے کے باوجود یہ طوفانی طاقت بھی ہمارے اجتماعی ذہن کی ساخت کو توڑ نہیں سکی۔

فکر و خیال کی دنیا میں جو معرکے ہماری تاریخ میں لڑے گئے ہیں اور پھر توڑ پھوڑ کے ہنگاموں کے بعد ہمارا اجتماعی ذہن جس طرح اپنی جگہ پر بار بار قائم ہو جاتا ہے اس کا ریکارڈ ہمارا سوا ہزار سالہ ملی لٹریچر ہے۔ یہ لٹریچر ہماری بنیادی فکر کا پورا پورا جوہر شروع سے آخر تک اپنے اندر لیے چلا آرہا ہے۔ اس لٹریچر سے خارج کے ہر فکری حملے اور اندر کے ہر نظریاتی فتنے کا سراغ مل سکتا ہے۔ اس لٹریچر سے دفاعی جہاد کی ساری کوششوں کا اندازہ لگایا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جا سکتا ہے۔ یہ لٹریچر بتاتا ہے کہ ہماری دلیل کی قوت کتنی مضبوط اور ہمارے ایمان کی طاقت کتنی اٹل ہے۔ اس لٹریچر میں ہماری اخلاقی قدریں محفوظ ہیں۔ یہ ہماری اعلیٰ اور تابندہ روایات کو آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ یہ ہمارے دیرینہ اور گہرے جذبوں کا آئینہ دار ہے اور یہ ہمیں وہ چیز دیتا ہے جو ہماری ساری تاریخ کے واقعاتی و فکری تصادموں کے اندر چٹان کی طرح جمی کھڑی رہتی ہے اور طوفانی تاریکیوں میں جگمگاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ہمارا وہ ذہنی سرمایہ ہے جو مستقل قدر و قیمت رکھتا ہے۔ تفسیر کے دفتر دیکھیے یا احادیث کے ذخیروں کا جائزہ لیجیے، فلسفہ و تصوف کی کتابیں سامنے رکھیے یا طب اور کیمیا کی تاریخ اور عمرانیات پر تصانیف ملاحظہ فرمائیے یا اخلاق، سیاست، معیشت اور مالیات پر ٹھوس معلوماتی نتائج کاوش پر نگاہ ڈالیے یا ہلکے پھلکے ادب شعر پر، پورا لٹریچر مجموعی حیثیت میں بول بول کر کہہ رہا ہے کہ میں ایک مسلم ملت کا سرمایۂ فکر و کاوش ہوں۔ پھر بالکل قرونِ اولیٰ کے علمی کارناموں سے گذر جائیے، یا قرونِ متوسط کے، یا بالکل آخری دور کے، یہ سب کے سب ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہمیں اسلام کی بارگاہ تک لے جاتے ہیں اور ہمیں ہمارے اصل مرکز ذہن سے ہٹنے نہیں دیتے۔ اس آخری دور میں خود اس عظیم کے مسلم لٹریچر کے عجائب خانے میں داخل ہو کر دیکھیے تو یہاں آپ کو شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ عبدالحق محدث دہلوی، شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمود الحسن سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا آزاد، مولانا ظفر علی خان۔ مولانا محمد علی جوہر۔ علامہ شبلی نعمانی، اکبر شاہ خان نجیب آباد، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، مولانا حالی علامہ اقبال۔ ڈاکٹر حمید اللہ، مولانا عبدالماجد دریابادی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی اور دوسرے بے شمار اہل علم کی کتابوں کے انبار کے انبار ملیں گے، جن سے کوئی بھی مطالعہ کرنے والا بچ بچا کے نہیں نکل سکتا، بلکہ وہ لوگ بھی جو بظاہر کچھ انوکھی باتیں کرنے والے ہیں یا کسی پہلو سے بہک گئے ہیں ان کے قلمی کام میں بھی اسلام کے کچھ نہ کچھ پہلو ضرور نمایاں ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی اس سارے علمی سرمائے کو دیکھیے تو یہ نئی نسلوں کو اسلام سے ہٹانے والا نہیں اسلام کی طرف کھینچ لے جانے والا اور اسلامی حس کو بیدار کرنے اور اسلامی شعور کو زندہ کرنے والا ہے۔ صحافت اور خطابت کو بھی اگر اجتماعی ذہن کے اظہار کا ذریعہ ہونے کی حیثیت سے لٹریچر کے ساتھ لے لیا جائے تو ان میدانوں میں بھی اسلام ابھرتا ہوا ملے گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ایسی ایسی زبانوں سے بولتا ہوا ملے گا کہ آپ حیرت میں ڈوبے رہ جائیں گے۔ ہاں! اجتماعی ذہن اسی طرح ہر ہر زبان سے بولا کرتا ہے۔

درحقیقت ہمارے لٹریچر پر قرآن اور حدیث اپنا سایہ پھیلائے ہوئے ہیں۔ یہ ہماری لٹریری سرگرمیوں کا منبع ہیں۔ قرآن جس کے ایک ایک لفظ کے من جانب اللہ اور برحق اور نور ہدایت ہونے پر ہمارا ایمان ہے، قرآن جسے ہمارے حافظے سینے میں جذب کرتے ہیں، قرآن جسے خواندہ اور ان پڑھ سارے ہی طبقے پڑھتے ہیں، قرآن جسے نمازوں میں دوہرایا جاتا رہتا ہے، قرآن جس پر درس ہوتے ہیں، قرآن جس سے ہماری مجالس کی کارروائیوں کا افتتاح ہوتا ہے، قرآن جس کے مقابلے پر آج تک کوئی دوسری کتاب ہمارے ہاں شائع نہیں ہوتی، وہ قرآن جو ہمارے عالم افکار پر آفتاب بن کے چمکتا ہے۔ اور حدیث جسے ہم قرآن کی مستند شرح مانتے ہیں، حدیث جس میں رسولِ خدا کی نمونہ کی زندگی کا ریکارڈ ہے، حدیث جس کے ریکارڈ کرنے، جس کے نتھارنے، جس کو بعد کی نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے انتہا درجہ کی محنتیں اور دماغ سوزیاں کی گئی ہیں، حدیث جو ہمارے دینی نصاب کا اہم جزو ہے، حدیث جس سے قانونِ شرعی کی مستند تفاصیل ملتی ہیں، حدیث جس سے روزمرہ زندگی میں رہنمائی لی جاتی ہے۔ وہ حدیث جو ہمارے علمی و ادبی چمن زاروں پر ہمیشہ ابرِ بہار بن کے برستی ہے۔ قرآن و حدیث وہ فکری طاقت ہیں جس نے ہمارے سوا ہزار سالہ لٹریچر کو مستقل اسلامی مزاج دیا ہے۔

اجتماعی ذہن کی یہ کارفرما طاقت جس کا آئینہ دار ہمارا وسیع لٹریچر ہے کس طرح اتنا بے وزن قرار دیا جا سکتا ہے کہ کہ ایک قوم کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ اس کے علی الرغم کسی دوسری شکل میں کر دیا جائے۔ نہ اس لٹریچر کو کتب خانہ بغداد کی طرح آگ کے شعلوں اور دجلہ کی لہروں کے حوالے کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی چھو منتر سے اس کے مزاج کو بدلا جا سکتا ہے، اور نہ اسے نظر انداز کر کے ایک انچ بھی آگے بڑھنا ممکن ہے۔

اجتماعی ذہن اگر شعور و فکر کا مظہر ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ایک دوسری چیز اجتماعی ضمیر پائی جاتی ہے جو وجدانی رجحانات کی ترجمانی کرتی ہے۔ جس قوم کا اجتماعی ضمیر مر جاتا ہے اس کے ساتھ جو کچھ بھی آپ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں اور جدھر بھی اسے لے جانا چاہیں لے جا سکتے ہیں۔ وہ نت نئے سانچوں میں پڑ کر اپنی شکل بدل سکتی ہے اور نت نئی سمت کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رُخ کر کے سفر کا آغاز کر سکتی ہے۔ وہ خیر و شر کے معیارات اور قدروں کے پیمانوں کو بار بار توڑ کر نئی صورت دے سکتی ہے اب اگر ہمارا کوئی اجتماعی ضمیر سرے سے نہ ہوتا، یا ہوتا تو مرگیا ہوتا، یا زندہ رہتا مگر مسخ ہو چکا ہوتا تو بآسانی ہم ہر بے تکا موڑ مڑ سکتے تھے۔ مگر یہاں ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔ مسلمانوں میں یہ ایک مستقل حس موجود ہے کہ حالات کی جو تبدیلی اسلام کے حق میں واقع ہوتی ہے وہ اس پر اطمینان کی کیفیت محسوس کرتے ہیں اور زندگی جو موڑ بھی اسلام کے خلاف مڑتی ہے اس پر وہ مضطرب ہونے لگتے ہیں اور ان کا یہ اضطراب مسلسل زندہ رہتا ہے۔ یہ ان کا اجتماعی ضمیر ہے جو انہیں کسی ایسی حالت پر راضی نہیں ہونے دیتا جو غیر اسلامی فکر و عمل کی مظہر ہو۔ یہ ان کا اجتماعی ضمیر ہے جو زندگی کو مذہب و سیاست کے دو خانوں میں بانٹ کر دو متضاد نظریوں کو یکجا کرنے پر کبھی امن چین نہیں پانے دیتا۔ یہ ان کا اجتماعی ضمیر ہے جس کے زیر اثر وہ ہر اس تضاد اور تصادم پر نالاں ہوتے ہیں جو ان کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ اُن کا اجتماعی ضمیر ہے جو غیر اسلامی نظاموں کی چمک دمک سے ان کو مرعوب نہیں ہونے دیتا۔ یہ ان کا اجتماعی ضمیر ہے جو انہیں ہر باطل کے خلاف ذوقِ تغیر سے سرشار کر کر کے اٹھا کھڑا کرتا ہے۔

اب یا تو کوئی ایسا کامیاب نسخہ کسی لقراطِ دوراں کے ہاتھ آجائے جس کے استعمال سے یہ ضمیر قطعی طور پر مرجائے یا اسے مسخ کر کے کوئی اور شکل دی جاسکے، ورنہ جب تک یہ اپنا کام کر رہا ہے کسی بھی مسلمان قوم پر اسلام کے اصولوں سے ہٹا ہوا کوئی دستوری نقشہ ٹھونسا نہیں جاسکتا۔

آزادی حاصل کرنے کے بعد کسی بھی قوم میں نظام وہ چلتا ہے جو اس محرکِ آزادی کے مطابق ہو جس کی تحریک سے اس نے سردھڑ کی بازی لگا کر غیروں کی غلامی سے نجات پائی ہو۔ چنانچہ آزادی کی جدوجہد کے دوران میں ہی زندگی کا وہ نقشہ، معاشرے کی وہ تقدیر اور قوم کا سیاسی نظم متعین ہو جاتا ہے جس پر آزادی کی نئی تعمیر شروع ہونے والی ہوتی ہے۔ اب غور فرمایئے ، کیا مسلمانوں کو آزادی یونہی بلا کسی جدوجہد کے چھپر پھاڑ کر مل گئی ہے اور اب ان کو معلوم نہیں کہ اس کا مصرف کیا ہے؟ اگر انہوں نے ہر ہر ملک میں آزادی جدوجہد سے حاصل کی ہے تو کیا یہ جدوجہد بغیر کسی محرک کے واقع ہو گئی، یہ گاڑی کسی اسٹیم کے بغیر قرنوں کی مسافت طے کر گئی! لیکن اگر کوئی محرک تھا تو اس محرک سے ہٹ کر مستقبل کا کوئی نقشہ نہیں سوچ سکتے! سوال صرف یہ ہے کہ وہ محرک کیا تھا؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ لوگ جو مسلمان قوموں کو مغربی نظامِ حیات کی طرف لے جانا چاہتے ہیں وہ گویا اس مفروضے پر چل رہے ہیں کہ مسلمان قومیں اس جذبے سے آزادی کی جد و جہد کر رہی تھیں کہ وہ مغربی نظامِ حیات کی طرف مارچ کرنا چاہتی تھیں اور سامراج اس میں حائل تھا ؟ کیا یہ مفروضہ اپنے اندر ہزارویں حصے کی حد تک بھی کوئی صداقت رکھتا ہے ؟ کوئی اس کا دعویٰ کر سکتا ہے ؟ البتہ قابلِ غور ہے ان لوگوں کا نظریہ جو یہ کہتے ہیں کہ غیروں کے معاشی استحصال سے نجات پانے کا تشکیلی محرک اصل کارفرما قوت تھا۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اقوام کی جد و جہدِ آزادی کے محرکات میں یہ چیز بھی شامل ہوتی ہے کہ وہ معاشی ظلم سے نکلنا چاہتی ہیں اور استقلال کی سطح پر آنا چاہتی ہیں تاکہ وہ جس کھیت کو بوئیں اس کی فصل خود کھا سکیں لیکن کسی قوم کی مثال ایسی نہیں پیش کی جا سکتی جو تنہا معاشی محرک کے بل پر آزادی کی جنگ لڑی ہو۔ لازماً دوسرے محرکات شامل ہوتے ہیں اور مختلف محرکات میں سے کوئی ایک پیش پیش طاقت (GOVERNING FORCE) بن کر کام کرتا ہے۔ معاشی استحصال جس درجہ انسان کو کھٹکتا ہے اس سے کئی گنا زیادہ یہ بات اسے مضطرب کرتی ہے کہ وہ جن اعتقادات، جن رجحانات، جن خیالات اور جن اخلاقی قدروں اور جن تاریخی روایات کو اپنا اصل سرمایۂ حیات سمجھتا ہو، کوئی حکومت اجتماعی نظام کو ان کے بالکل مخالف راستے پر چلائے، جن چیزوں کو لوگ محبوب رکھتے ہوں ان کی قدر و قیمت ختم ہو جائے، جن کو وہ نفرت سے دیکھتے ہوں وہ پورے ماحول پر چھا جائیں، جن کو وہ حرام سمجھتے ہوں وہ حلال ہو جائیں اور جن کو حلال گردانتے ہوں وہ حرام کر دی جائیں، جن امور کو وہ گناہ سمجھتے ہوں وہ لازمۂ حیات بننے لگیں اور جس کو وہ صواب مانتے ہوں وہ جرم بنا دی جائیں۔ اپنی مرضی کے نظام اور ماحول کے بجائے جب برعکس قسم کا نظام اور ماحول کسی معاشرے پر مسلط ہو جاتا ہے تو وہاں ارادے اور امنگیں اور دلچسپیاں ہر طرف سے بھینچ جاتی ہیں، گویا سانس گھٹنے لگتی ہے۔ خون کا دوران تھمنے لگتا ہے۔ اس حالت کا نتیجہ کرب ہے۔ یہی کرب جد و جہدِ آزادی کی شکل اختیار کرتا ہے۔ ہم جیسا کہ اوپر بیان کر آئے ہیں، ہمارا ایک مخصوص اعتقاد ہے اور زندہ اعتقاد ہے، ہماری ایک تاریخ ہے اور موثر تاریخ ہے، ہمارا ایک اجتماعی ذہن ہے اور فعال ذہن ہے، ہمارا ایک ملی ضمیر ہے اور جیتا جاگتا ضمیر ہے۔ غلامی کے ماحول نے جب ان میں سے ہر چیز سے ٹکرانا اور اسے بھینچنا شروع کیا تو اضطراب پیدا ہوا اور وہی اضطراب پھر محرکِ جد و جہد بنا۔ آپ چاہیں جس مسلمان قوم کی تازہ تاریخ کو اٹھا کے دیکھ لیں اس میں آپ کو یہ امر واقعہ ضرور ملے گا کہ مسلمان قوموں کی جد و جہد آزادی میں خود اسلام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حرکت و اقدام کر رہا ہے اور دینی طاقتیں ایسی جدوجہد میں پیش پیش ہیں۔ جہاں بھی مغربی قوموں کے تسلط کے خلاف کوئی تحریک اٹھی ہے براہ راست مغربی فکر و تہذیب کے خلاف اٹھی ہے اور اعتقادی و دینی بنیادوں پر اٹھی ہے۔ ہر جگہ احیائے اسلام اور نظام اسلامی کی منزل تک پہنچنے کا جذبہ کام کرتا ملتا ہے۔ تقریروں اور نعروں کو دیکھیے تو یہی شہادت ملتی ہے کہ ان تحریکوں کی منزل ہر جگہ قرآن کے اصولوں پر اپنے ایمان کے مطابق ایک ریاست اور معاشرہ تعمیر کرنا ہے۔

تحریک پاکستان کی نوعیت بھی قطعاً یہی ہے۔ جدوجہد آزادی کے مختلف محرکات پر جو چیز چھائی ہوئی ہے وہ ایک ناسازگار غیر اسلامی نظام سے نکل کر ایک اسلامی نظام تک پہنچنے کا جذبہ ہے۔ اس تحریک کا لٹریچر (جو کچھ وہ ہے) اس کی تقریریں، اس کے ریزولیوشن، اس کے نعرے، اس کی بولی، اس کی اصطلاحات سب کے اندر یہی جذبہ بول رہا ہے۔ یہ مسلمانوں کے ایک جداگانہ قوم ہونے کے عقیدے سے بننے والی قوم، ایک جداگانہ نظریۂ حیات رکھنے والی قوم اور ایک مستقل تہذیب کی مالک قوم کی تحریک بن کے اٹھی۔ اسی لحاظ سے اس کو چلانے والی تنظیم مسلم لیگ کے نام سے سامنے آئی۔ اسی لحاظ سے زمین کے نقشے پر ابھرنے والی نئی مملکت کا نام پہلے سے پاکستان رکھا گیا یعنی ایک پاک قوم کا گھر جو پاک اصولوں پر ایک پاک نظام برپا کرنے والی ہے۔

ہمارا یہ محرکِ آزادی پہلے دن سے انگلی اٹھا کر بتا رہا تھا کہ ہمیں جانا کہاں ہے، پھر سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آج کچھ لوگوں کو کیوں التباس پیش آ گیا ہے کہ وہ سات برس سے پڑے سوچ رہے ہیں کہ ہم کیا کریں! اس محرکِ آزادی نے اب ایک تاریخی حقیقت کی شکل اختیار کر لی ہے اور اب اس سے آسانی سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا۔ اس سے تضاد رکھنے والا مستقبل یہاں کھپنے کا نہیں۔

آخری موثر طاقت جو ہمارے مستقبل کا تعین کر رہی ہے، ہمارا ارادۂ عمومی (PAPULAR WILL) ہے۔ اوپر کی ساری چیزیں مل جل کر اس ارادۂ عمومی کو پیدا کرتی ہیں۔ ان سارے موثرات کے شعوری، نیم شعوری اور غیر شعوری عمل سے اب ایک سوچا سمجھا ہوا ارادہ پوری کی پوری قوم میں کارفرما ہو چکا ہے۔ شہر اور قصبے ہوں، یا دور افتادہ دیہات، جہاں جائیے یہ ارادۂ اجتماعی یکساں موجزن ہے۔ یہ بڑے بڑے جلسوں کی صورت میں ظہور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتا ہے، یہ قراردادوں اور ریزولیوشنوں کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ تقاریر اور مقالات میں امڈ رہا ہے، یہ نجی مجالس اور گفتگوؤں پر اثر انداز ہے، یہ جماعتوں اور پارٹیوں کے منشوروں اور پروگراموں میں سے بول رہا ہے۔ آخر اسے کب تک جھٹلاؤ گے؟ قوموں کے جذبات اور میلانات جب تک دھندلے ہوں تو ان کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے، لیکن جب وہ متعین شعوری شکل اختیار کر کے ارادۂ عمومی بن جائیں تو پھر ان سے صرفِ نظر کرنے کی جرأت ایک حماقت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

اب تک کی گفتگو سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم نظریۂ جبریت کے قائل ہیں اور ہمارا خیال یہ ہے کہ کچھ ایسی نفسیاتی، اور تاریخی اور طبیعی قوتیں برسرِ عمل آگئی ہیں جن کے اندر انسانی ارادہ بالکل بے بس ہے کہ ایک خاص سمت کے سوا کسی اور طرف نہ جاسکے۔ نہیں ہم انسانی ارادہ کی طاقت کی برتری کے قائل ہیں جو اللہ تعالےٰ نے اسے دی ہے لیکن ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ مختلف موثر عوامل جو کارفرما ہیں ان کے تقاضے کو اگر رد کر کے چلنا ہو تو اس کی صورت ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ انسانی ارادہ ایک سخت انقلابی اقدام کے ذریعے ان عوامل سے ٹکرائے اور ان کو توڑ پھوڑ کر آگے نکل جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسے سخت انقلابی اقدام کے لیے جو سروسامان ہوتا ہے وہ موجود ہے یا اس کے ہم پہنچانے کی تیاریاں اب تک ہماری ارادی قوتوں نے کی ہیں یا ہمارے اندر ان تیاریوں کی ضرورت ہی کا کوئی احساس موجود ہے؟ ان میں سے کوئی بھی چیز نہیں۔ بخلاف اس کے ہمارے شعوری ارادوں نے انقلابی حرکت اگر شروع کی ہے تو ان عوامل کے خلاف جو اسلام کے خلاف پڑتے ہیں۔ لیکن وہ عوامل جو اسلام کے زیرِ اثر اور اسلام کے مطابق کام کر رہے ہیں ان کو ہمارے شعوری ارادوں نے قبول کر لیا ہے۔

ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ ہمارے ملک کی کوئی طاقت ان عوامل سے آنکھیں بند کر کے اندھا دھند قدم اٹھانے کی حماقت نہیں کر سکتی۔ ضرور کر سکتی ہے۔ مگر ہمارا مدعا صرف یہ ہے کہ ایسی حماقت سے کبھی اچھے نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ کوئی ایسا دستوری مستقبل اور کوئی ایسی سیاسی تقدیر جسے مذکورہ بالا زوردار عوامل کے خلاف قوم پر ٹھونسنے کی کوشش کی جائے وہ ایک ایسا ناخوشگوار بارِ گراں بن کے ہمارے اوپر لدے گی جسے اولین موقع ملتے ہی عوام سروں سے اتار پھینکیں گے۔ ایسے دستوری مستقبل اور ایسی سیاسی تقدیر کو محبت کے ساتھ نہیں، ہمیشہ نفرت اور بے دلی کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے لیے کبھی جذباتِ عمل نہیں پیدا ہوتے بلکہ جمود پیدا ہوتا ہے جو بتدریج اضطراب میں بدلتا ہے اور بالآخر انقلاب تک نوبت جا پہنچتی ہے۔ ایسی دھاندلیاں چار چھ مہینے، سال دو سال چل سکتی ہیں لیکن استقلال نہیں پا سکتیں۔ ایسے چام کے سکے ایک آدھ دن چل جاتے ہیں، اس کے بعد ان کی قدر و قیمت ختم ہو جاتی ہے۔ تاریخ انسانی میں جو بھی بےتکی چیز لا کے نصب کر دی جائے اسے تاریخی عوامل توڑ پھوڑ کے رکھ دیتے ہیں۔

یہ جو آئے دن کبھی کنٹرولڈ ڈیموکریسی اور کبھی عبوری دستور کے منصوبے نمودار ہوتے رہتے ہیں ان کے موجدوں کے لیے ہم اللہ تعالیٰ سے سمجھ بوجھ پانے کی دعا کرتے ہیں کہ خدا کے لیے اپنی قوم کی اجتماعی زندگی کے موثر عوامل سے کشتی لڑنے کا فیصلہ نہ کریں۔ اس کشتی میں کوئی پہلوان پالا نہیں مار سکتا۔

دوسری طرف ہم عوام کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہ جس نظامِ زندگی کے لیے اپنے اندر ایمان اور جس کے لیے جدوجہد کرنے کا عزم رکھتے ہیں، اس کی خاطر اگر وہ انگریزی تسلط اور ہندو امپیریلزم کے خطرے سے نبرد آزما ہو کر یہاں تک آ گئے ہیں تو آئندہ بھی کوئی ناموافق صورتِ حالات ان کے آڑے نہیں آ سکتی۔ چند مہینوں اور چند سالوں کی گردشیں بظاہر کتنی ہی ناسازگار اور مایوس کن کیوں نہ ہوں، اجتماعی رجحانات اور عمومی ارادوں کا راستہ روک نہیں سکتیں۔ حالات جتنے ناسازگار رہوں زندہ قوموں کا ولولۂ عمل اتنا ہی زوردار ہو جانا چاہیے۔

تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست

بقیہ (ایک ضروری استدراک، صفحہ ۵۶) اور شبہ اور گمان پر دلالت کرنے والے الفاظ بھی مروی ہیں۔ مثلاً ابن صیاد کے متعلق آپؐ کا حضرت عمرؓ سے یہ فرمانا کہ "اگر یہ دجال ہی ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو، اور اگر یہ وہ نہیں ہے تو تمہیں ایک ذمی کو قتل کرنے کا کوئی حق نہیں"۔ یا مثلاً ایک حدیث میں آپؐ کا یہ ارشاد کہ "اگر وہ میری زندگی میں آ گیا تو میں بحیثیت سے اس کا مقابلہ کروں گا ورنہ میرے بعد میرا ربّ ہر مومن کا حامی و ناصر ہے ہی"۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اس دوسرے جزء کی دینی اور اصولی حیثیت وہ نہیں ہے اور نہیں ہو سکتی جو پہلے جزء کی ہے اس کی تمام تفصیلات کو بھی پہلے جزء کی طرح یقینی قرار دینا زیادتی ہے بلکہ اس کے ہر حصے کی صحت کا دعویٰ کرنا بھی درست نہیں ہے"

صفحہ ۵۷۔ سطر ۴، ۵ کی عبارت میں یہ ترمیم کر دی جائے:

"لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ساڑھے تیرہ سو برس گزر چکے ہیں اور ابھی تک دجال نہیں آیا ہے؟"

اسی صفحہ پر سطر ۷ تا ۹ کو اس طرح لکھا جائے:

"اس قسم کے معاملات میں اگر کوئی بات نبی کے قیاس یا گمان یا اندیشے کے مطابق نہ نکلے تو یہ اس کے منصبِ نبوت میں ہرگز قادح نہیں"۔

خاکسار ابوالاعلیٰ

© rasailojaraid.com